

جنوبی ایشیائی تناظر میں صدے کی از سر نو تفہیم: اردو ادب کا فکری کردار

Rethinking Trauma in the South Asian Context: The Conceptual Role of Urdu Literature

HUMAIRA SADAF

PhD Scholar, Centre for the Study and Research on the Literatures and Oralities of the World (CERLOM),
INALCO, Paris, France
(humaira.sadaf@inalco.fr)

CONFLICT OF INTEREST: The author declares that there are no conflicts of interest related to the research, authorship, and/or publication of this article, and that the data presented have not been fabricated or falsified.

FUNDING: This research did not receive any specific grant or financial support from public, commercial, or not-for-profit funding agencies.

PARTICIPANT CONSENT: The author confirms that Informed consent was obtained from all participants, and confidentiality was duly maintained.

KEYWORDS: Trauma Studies, South Asian Context, Urdu Literature, Postcolonial Theory, Partition of India, Memory and Identity, Decolonizing Knowledge

ABSTRACT: This article re-conceptualizes trauma within a South Asian context by examining Urdu literature as a critical and theoretical resource. It critiques dominant trauma studies, which are largely shaped by Eurocentric frameworks that define trauma in terms of rupture, fragmentation, and psychological breakdown. While such models illuminate important aspects of traumatic experience, they remain limited in addressing the historical and cultural complexities of postcolonial societies.

Focusing particularly on Partition-related narratives, the study argues that Urdu literature offers alternative epistemologies of trauma that extend beyond clinical and event-centered interpretations. Through close reading of selected texts, it demonstrates that trauma in these narratives is not restricted to individual psychological disturbance but is deeply embedded in broader structures of history, memory, identity, gender, and state formation.

Rather than producing only rupture or collapse, trauma in Urdu literary expression often generates processes of reinterpretation, ethical reflection, and aesthetic reconfiguration. In this way, Urdu literature transforms trauma into a dynamic site of meaning-making, cultural negotiation, and historical consciousness, thereby expanding the theoretical horizons of trauma studies in the South Asian context.



This work is licensed under a [Creative Commons Attribution-Non Commercial 4.0 International License \(CC BY-NC 4.0\)](https://creativecommons.org/licenses/by-nc/4.0/)

"صدمة وہ نہیں جو آپ کے ساتھ پیش آتا ہے بلکہ وہ ہے جو آپ کے اندر وقوع پذیر ہوتا ہے" (1) اگر صدمہ محض ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک داخلی اور جاری کیفیت ہے تو پھر یہ سوال اہم ہو جاتا ہے کہ ہم اسے کیسے سمجھتے ہیں، بیان کرتے ہیں اور اس کی تعبیر کیسے تشکیل دیتے ہیں۔ جدید صدمہ تھیوری جو بنیادی طور پر مغربی فکری روایت میں تشکیل پاتی ہے، صدمے کو ایک ایسے تجربے کے طور

پر پیش کرتی ہے جو اپنی ماہیت میں ناقابل بیان اور فہم سے ماوراء ہے۔ تاہم یہ تعبیر اس وقت پیچیدہ ہو جاتی ہے جب اسے ان معاشروں پر منطبق کیا جاتا ہے جہاں صدمہ محض ایک وقتی واقعہ نہیں بلکہ ایک مسلسل تاریخی اور اجتماعی تجربہ ہوتا ہے۔

صدمے (trauma) کا تصور ابتدا میں طب اور نفسیات کے دائرے میں ایک شخصی اور حیاتی و نفسیاتی کیفیت کے طور پر سمجھا گیا، جہاں اسے بیرونی عوامل کے زیر اثر پیدا ہونے والی ایک مقامی تبدیلی تصور کیا جاتا تھا۔ تاہم جدید دور خصوصاً سرمایہ دارانہ نظام، شہری پھیلاؤ، فطرت پر انسان کے بڑھتے ہوئے اثرات اور سماجی و سیاسی تغیرات کے نتیجے میں صدمہ محض ایک شخصی تجربہ نہیں رہا بلکہ ایک وسیع سماجی اور تاریخی مظہر کے طور پر سامنے آیا۔ یعنی جنگ، دہشت گردی، تشدد، نوآبادیاتی استحصال، نسل کشی اور سماجی و سیاسی ناہمواریوں جیسے عالمی مظاہر کے تناظر میں صدمہ ایک جدید اور ہمہ گیر حقیقت بن چکا ہے، جو نہ صرف اجتماعی سطح پر بلکہ روزمرہ کے سماجی رویوں اور تجربات میں بھی اپنی موجودگی ظاہر کرتا ہے۔

صدمہ تھیوری (trauma theory) کی موجودہ تشکیل زیادہ تر مغربی فکری روایت تک محدود رہی ہے، جہاں اسے خاص تاریخی اور ثقافتی تناظر میں سمجھا گیا ہے۔ نتیجتاً غیر مغربی معاشروں بالخصوص جنوبی ایشیا کے صدماتی تجربات کو یا تو نظر انداز کیا گیا ہے یا انہیں مغربی نظریاتی سانچوں میں سامنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جنوبی ایشیا خصوصاً تقسیم ہند ایسے ہی ایک تاریخی اور وجودی صدمے کی مثال ہے جس نے نہ صرف افراد بلکہ پوری سماجی ساخت کو متاثر کیا۔ لیکن اس کثیر الجہت اور تاریخی صدمے کے تجربات کے مطالعے کے لیے صدمے کی موجودہ تھیوریز کسی نہ کسی پہلو سے ناکام نظر آتی ہیں۔ کیونکہ وہ زیادہ تر مغربی تاریخی اور ثقافتی تناظر تک محدود ہیں۔

ایسے میں یہ سوال اہم ہو جاتا ہے کہ آیا صدمے کی تفہیم کو ایک نئے تناظر میں از سر نو ترتیب دیا جاسکتا ہے جو جنوبی ایشیائی تجربات اور ادب میں موجود صدماتی بیانیوں کو مرکز میں رکھے۔ یہ تحقیق اس امر کا جائزہ لینے کی کوشش ہے کہ اردو ادب نہ صرف صدمے کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ اس کی ایک ایسی فلسفیانہ تعبیر بھی پیش کرتا ہے جو مغربی صدمہ تھیوری کی حدود کو چیلنج کرتی ہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں صدمہ تھیوری کا عروج علوم انسانیات میں ایک اہم فکری تبدیلی کے طور پر سامنے آیا جسے اکثر "اخلاقی موڑ" (ethical turn) کہا جاتا ہے۔ جہاں فلسفہ، ادب اور نفسیات کے باہمی ربط سے انسانی مصائب کی ماہیت اور اس کے اخلاقی تقاضوں پر از سر نو غور کیا گیا۔ یہ تھیوری جس نے ابتدا میں امریکہ میں زور پکڑا، نفسیاتی اور ما بعد ساختیاتی فریم ورک کے ذریعے اس کی نوعیت کو سمجھنے کی سعی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اس نقطہ نظر کی بنیاد سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) کے نفسیاتی نظریات سے جڑی ہوئی ہے جہاں صدمے کو ایک ایسے نفسیاتی زخم کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو براہ راست ظاہر نہیں ہوتا بلکہ دباؤ اور لاشعور کے تناظر میں تکرار اور علامات کے ذریعے ابھرتا ہے۔^(۲) فرائڈ نے اپنی تصانیف جیسے 'Beyond the Pleasure Principle' میں صدمے کو ایک ایسے شدید محرک کے طور پر بیان کیا جو قلیل مدت میں فرد پر اثر انداز ہوتا ہے اور اسے معمول کی ذہنی حالت میں واپس آنے سے روکتا ہے اور یہ تصور جنگ کے بعد فوجیوں کے ڈراؤنے خوابوں جیسی علامات کا تجربہ کرنے میں معاون ثابت ہوا۔ یہ نقطہ نظر جو ہسٹیریا کے مطالعے اور جنگ عظیم اول کے سابق فوجیوں کے ساتھ فرائڈ کے کام سے ماخوذ ہے، اس بات پر زور دیتا ہے کہ صدمہ ایک ایسی دراندازی ہے جو فرد کی دفاعی ڈھال کو توڑ دیتی ہے۔

اس تصور کو کیتھی کیر و تھ (Cathy Cruth) نے مزید وسعت دی جنہوں نے صدمے کو محض ایک دبا ہوا واقعہ نہیں بلکہ ایک ایسا "ناقابل بیان" اور "تائیری" تجربہ قرار دیا جو زبان کی حدود سے باہر ہوتا ہے۔ خاص طور پر، کیتھی کیر و تھ کی کتاب "Unclaimed Experience: Trauma, Narrative, and History" نے ۱۹۹۰ء کی دہائی میں اس شعبے میں ایک نئے دور کا آغاز کیا، جس میں صدمے کے تجربے کو روایت اور تاریخ کے تعلق سے دیکھا گیا۔^(۳) اس تناظر میں، یہ تھیوری اس بات کو بھی اجاگر کرتی ہے کہ کس طرح صدماتی تجربات، جنہیں والٹر بینجمن (Walter Benjamin) "صدمہ" یا "جھکا" سے تعبیر کرتے ہیں، تاریخی شعور اور اس کی ترجمانی کو از سر نو تشکیل دیتے ہیں۔ یعنی تاریخ صرف فاتحین کا بیانیہ نہیں رہتی بلکہ والٹر بینجمن کے فلسفے کی روشنی میں یہ ہارے ہوئے لوگوں کی آوازوں اور ان کے غیر تحریری تجربات کو بھی شامل کرتی ہے جو روایتی تاریخ نگاری کے خاموش کردہ پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے۔^(۴)

یہ دہائی خاص طور پر اس لیے اہم ہے کیونکہ اس میں ہولوکاسٹ جیسے بڑے پیمانے پر ہونے والے صدمات کو سمجھنے کے لیے نئے لسانی اور فکری ماڈلز کی ضرورت محسوس کی گئی۔ یہ تبدیلی مابعد ساختیاتی متنیت (poststructuralist textualism) کے محدود تصورات کے رد عمل کے طور پر سامنے آئی، جو تاریخ، سیاست اور اخلاقیات جیسے "حقیقی دنیا" کے مسائل سے اپنی دوری کی وجہ سے تنقید کا نشانہ بنی تھی۔ مابعد ساختیاتی متنیت کے دعوے کے مطابق تمام حقیقت لسانی تعمیرات کے ذریعے سمجھی جاتی ہے۔ صدمہ تھیوری کے مفکرین نے گو اس فلسفے سے اثر قبول کیا لیکن اس بات پر زور دیا کہ صدمے کا تجربہ لسانی حدود کو پار کر جاتا ہے اور یہ کہ محض متنی تحلیل حقیقی تکلیف اور اس کے اخلاقی تقاضوں کو پوری طرح سے گرفت میں نہیں لے سکتی۔ صدمہ تھیوری نے ادب اور تنقید کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے کی دعوت دی جہاں متن کو محض لسانی ساخت کے بجائے تاریخی، سیاسی اور اخلاقی ذمہ داریوں سے جوڑ کر دیکھا جانے لگا۔ اس تناظر میں، یہ نظریہ صدمے کی بازگشت کو سمجھنے پر مرکوز ہے جو انفرادی اور اجتماعی یادداشتوں میں گہری پیوست ہوتی ہے۔ خاص طور پر "دوسرے" کے دکھ کو تسلیم کرنے اور اس کے ساتھ بین الثقافتی اخلاقی وابستگی قائم کرنے پر زور دیتا ہے۔

ایک امریکی محقق کالی ٹال (Kali Tal) کی "Worlds of Hurt: Reading the Literatures of Trauma" جیسی تصانیف نے ادبی تجزیہ میں صدمہ تھیوری کے اطلاق کے لیے نئے افق کھولے۔ جس سے مابعد ساختیاتی نقطہ نظر سے ہٹ کر صدمے کے نیورولوجیکل پہلوؤں پر بھی توجہ دی گئی۔ کیتھی کیر و تھ (Cathy Caruth)، شوشانا فیلمان (Shoshana Felman) اور جفری ہارٹمن (Geoffrey Hartman) جیسے مفکرین نے اس نظریاتی فریم ورک کو پروان چڑھایا، جہاں صدمے کو ایک تاخیر شدہ، ناقابل ادراک تجربے کے طور پر پیش کیا گیا جو تاریخ میں اپنی موجودگی کا دعویٰ کرتا ہے۔^(۵) کیر و تھ نے خاص طور پر صدمے کو ایک ایسے شدید دردناک تجربے کے طور پر پیش کیا جسے ذہن فوری طور پر سمجھ نہیں پاتا، اور متاثرہ فرد واقعے کو مکمل طور پر بھول بھی سکتا ہے۔ لیکن اس کی یادیں غیر لسانی شکل میں واپس آتی ہیں۔

ییل (Yale) سکول سے تعلق رکھنے والے ان مفکرین نے صدمہ تھیوری کو ہولوکاسٹ کے متاثرین کی گواہیوں اور ادبی شہادتوں پر مبنی کیا جو ابتدا میں ویتنام جنگ کے سابق فوجیوں کے نفسیاتی صدمے کے تناظر میں تیار کردہ طبی تصورات سے متاثر تھی۔ اس

طرح انھوں نے ادب اور نفسیات کے درمیان ایک گہرا ربط قائم کرتے ہوئے صدمے کو ایک بین الضابطہ مطالعہ کے طور پر پیش کیا جہاں یادداشت، تاریخ اور اخلاقیات باہم مربوط ہیں۔ اسی فکری پس منظر میں جیفری ہارٹمن (Geoffrey Hartman) نے ٹیل (Yale) میں شوآہ (Shoah)^(۶) کے متاثرین کی زبانی گواہیوں کو جمع کرنے کے لیے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس کا مقصد متنتیت کی حدود سے نکل کر تاریخ کے ساتھ ایک براہ راست اور تجرباتی ربط قائم کرنا تھا۔ یہ عمل اس بات کو تقویت دیتا ہے کہ بیان کی حدیں اور سچائی کی پیشکش میں موجود خلا، حقیقت میں اس تجربے کی تصدیق کرتا ہے جو مکمل طور پر لسانی گرفت میں نہیں آسکتا۔ فیلمان (Felman) اور ڈوری لیب (Dori Laub) کے مطابق گواہی کے عمل کی دشواری نہ صرف گواہی دینے والے کے لیے بلکہ سننے والے کے لیے بھی ہوتی ہے جہاں سامع کو صدمے کے گہرے اثرات کو سمجھنے اور اسے جذب کرنے کی اخلاقی ذمہ داری اٹھانی پڑتی ہے۔^(۷)

ڈومینک لاکاپرا (Dominick LaCapra) جیسے مفکرین ہولوکاسٹ جیسے انتہائی واقعات کے تناظر میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ شناخت اور تجربے کے روایتی تصورات بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے مطابق ایسے صدمات کو نہ تو ایک سادہ اور خطی بیانیے میں سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی ایک نظریاتی زاویے سے مکمل طور پر گرفت میں لیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے وہ زور دیتے ہیں کہ صدمے کو سمجھنے کے لیے متعدد زاویوں اور حساس تنقیدی طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔^(۸) لاکاپرا صدمے کو محض ایک ناقابل بیان یا مسلسل دہرانے والے تجربے تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ وہ اس کے ساتھ "کام کرنے" (working through) کے امکان پر بھی زور دیتے ہیں۔ ان کا مشہور تصور "acting out" اور "working through" اس بات کو واضح کرتا ہے کہ جہاں ایک طرف صدمہ فرد کو ماضی میں جکڑ سکتا ہے وہیں دوسری طرف ایک تنقیدی اور شعوری عمل کے ذریعے اس کی تعبیر اور جزوی بازیابی بھی ممکن ہے۔ اس طرح لاکاپرا کا نظریہ صدمہ تصوری میں ایک اہم اضافہ ہے جو نہ صرف یادداشت اور تاریخ کے تعلق کو نئے انداز میں سمجھتا ہے بلکہ ایک اخلاقی اور ذمہ دارانہ تاریخ نویسی کی ضرورت پر بھی زور دیتا ہے۔

صدمہ تصوری اگرچہ نفسیاتی تکلیف کو سمجھنے کے لیے ایک اہم فریم ورک فراہم کرتی ہے، لیکن اس کی تشکیل میں کچھ اساسی حدود موجود ہیں جو اس کی آفاقی اطلاق پذیری پر سوالیہ نشان لگاتی ہیں۔ یہ حدود خاص طور پر یورومرکزیت^(۹) صدمے کے واقعہ پر مبنی بنیادی ماڈل کی پابندی، فرائیڈین نفسیاتی تجزیے پر زیادہ انحصار اور نظریے کے داخلی تضادات میں نمایاں ہیں۔ بنیادی تضاد اس نظریے کا یہ ہے کہ جہاں یہ نظریہ عالمی سطح پر اخلاقی وابستگی اور بین الثقافتی تفہیم کا دعویٰ کرتا ہے وہیں اس کا علمی ڈھانچہ اپنی ہی ساختی ہم آہنگی کو برقرار رکھنے میں ناکام رہتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ تصوری اکثر ہولوکاسٹ جیسے یک وقتی اور نمایاں واقعات کو صدمے کی آفاقی کسوٹی بنا دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی معاشروں کا وہ مسلسل اور ساختی صدمہ علمی دائرہ کار سے باہر رہ جاتا ہے جو کسی خاص لمحے کے بجائے دہائیوں پر محیط ریاستی جبر کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اس ضمن میں مائیکل روٹنبرگ (Michael Rothberg)^(۱۰) ایک نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ انہوں نے ۲۰۰۸ء میں اس امر کی نشاندہی کی کہ صدمہ تصوری اکثر یورپ و امریکی تاریخی تجربات پر توجہ مرکوز کھتی ہے جس کے نتیجے میں غیر مغربی معاشروں

کے صدماتی تجربات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا حاشیے پر دھکیل دیا جاتا ہے۔ یہ رجحان ثقافتی تنوع اور صدمے کے کثیر جہتی اظہار کو تسلیم کرنے میں رکاوٹ بنتا ہے اور عالمی سطح پر صدمے کی تفہیم کو محدود کرتا ہے۔

رو تھبرگ کا موقف اس بات پر زور دیتا ہے کہ صدمہ تھیوری کے بانی متون یعنی وہ ابتدائی اور مؤثر علمی و تحقیقی تحریریں جنہوں نے اس میدان کی بنیاد رکھی، اکثر غیر مغربی یا اقلیتی گروہوں کے صدماتی تجربات کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں یا ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ اس تناظر میں سٹیف کریپس (Stef Craps) نے بھی اس بات پر تنقید کی ہے کہ صدمے کے بنیادی نظریات بشمول کیر و تھ کے سے موجودہ نا انصافیوں اور عدم مساوات کو تقویت ملتی ہے۔⁽¹¹⁾ یہ نقطہ نظر ثقافتی سیاق و سباق کی اہمیت کو کمزور کرتا ہے۔ یہ مسئلہ خاص طور پر اس وقت پیچیدہ ہو جاتا ہے جب PTSD (پوسٹ ٹراویٹک اسٹریس ڈس آرڈر) جیسے مغربی ماڈلز کو عالمی سطح پر لاگو کیا جاتا ہے جو ہر ثقافتی سیاق و سباق کی مخصوص ذہنی صحت اور مصائب کی تشریح کو نظر انداز کرتا ہے۔ اس طرح غیر مغربی ثقافتوں میں صدمے کے جسمانی (somatized) اظہار کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے جہاں دائمی درد، تھکاوٹ، یا قلبی امراض جیسی جسمانی علامات دراصل صدمے کے گہرے نفسیاتی اثرات کی نمائندگی کرتی ہیں۔

یورومرکزی نقطہ نظر کے تحت صدمہ تھیوری کا یہ یکطرفہ اطلاق نوآبادیاتی دور میں ہونے والے شدید اور وسیع پیمانے کے صدمات کو بھی مناسب طریقے سے سمجھنے میں ناکام رہتا ہے جہاں نسل در نسل جاری رہنے والے مصائب کو محض انفرادی نفسیاتی مسائل کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ رجحان دراصل ثقافتی سامراجیت کی ایک شکل ہے جس میں صدمے کی تعریفیں مغربی نظریات میں جڑ پکڑ کر نفسیاتی اور طبی اصطلاحات میں ڈھل جاتی ہیں جو بالآخر ثقافتی جبر کی مزید تقویت کا باعث بنتی ہیں۔ اس کے برعکس، نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی تناظر میں صدمے کو اکثر ایک مسلسل، ساختی اور تاریخی عمل کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو کہ واحد واقعے سے کہیں زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

مشیل بالایف نے (Michelle Balaev) اپنے مضمون Trends in Literary Trauma Theory میں اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ صدمہ ہمیشہ شناخت کے انہدام کا باعث نہیں بنتا بلکہ بہت سے مواقع پر یہ ادراک اور یادداشت کی ایک نئی تنظیم کو جنم دیتا ہے جو مختلف ثقافتی تناظرات کے امتزاج سے معنی پیدا کرتی ہے۔⁽¹²⁾ اس تناظر میں یہ دعویٰ کہ "صدمہ شناخت کو مکمل طور پر توڑ دیتا ہے" اس تصور سے مختلف ہے کہ "صدماتی واقعات کی بیانیاتی نمائندگی شعور کو منتشر کر دیتی ہے"۔ پہلی صورت میں شناخت کے انہدام کو ایک مطلق علمی اور وجودی انقطاع کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو علم کے خلا یا اس کے مکمل مٹ جانے کی طرف اشارہ کرتا ہے؛ جبکہ دوسری صورت میں صدمہ اگرچہ فرد کے خودی (self) اور دنیا کے بارے میں پہلے سے موجود تصورات کو متاثر کرتا ہے۔ تاہم اکثر ایک موافقتی (adaptive) از سر نو ترتیب کا باعث بھی بنتا ہے جس کے ذریعے فرد ایک پرتشدد واقعے کے بعد اپنے ادراک کو نئے سرے سے منظم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر مشیل بالایف ایک ناول 'Ceremony' کا حوالہ دیتے ہیں کہ جہاں صدمے کو ایک بین الثقافتی تناظر میں پیش کیا گیا ہے اور مقامی لاگونا پوبلو (Laguna Pueblo) اور یورو-امریکی نقطہ نظر باہم مل کر ایک نئی تفہیم تشکیل دیتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار اپنی منتشر یادداشتوں سے اسی وقت نجات حاصل کر پاتا ہے جب وہ صدماتی تجربات کو

دونوں ثقافتی زاویوں سے دیکھتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ مقامی قبائلی فکری نظام کو سمجھتا ہے جو اس کے ذاتی تجربے کے پیچیدہ بین الثقافتی معنی کو محض ایک ذہنی بیماری جیسے PTSD سے آگے بڑھ کر سمجھنے میں مدد دیتا ہے، جسے 'سفید فام ڈاکٹروں نے محدود کر دیا تھا۔

اسی طرح صدماتی ناول میں یادداشت کو ایک فعال اور مسلسل تشکیل پانے والے عمل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو اس غالب تصور کو چیلنج کرتا ہے کہ صدماتی تجربہ منجمد ہو کر 'عام' یادداشت سے الگ ہو جاتا ہے۔ درحقیقت صدماتی یادداشت شاذ و نادر ہی واقعات کی عین اسی صورت میں واپسی ہوتی ہے بلکہ ہر بار بیان کے ساتھ اس میں نئے پہلو شامل ہو جاتے ہیں یا مختلف زاویوں سے اسے دوبارہ تشکیل دیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدمے کی یادداشتیں فرد کی موجودہ ضرورتوں کے مطابق مسلسل تبدیل اور از سر نو ترتیب ہوتی رہتی ہیں۔ اردو ادب میں اس کی واضح مثال انتظار حسین کے ناول "بستی" میں دیکھی جاسکتی ہے جہاں ماضی کی یادداشت ایک جامد حقیقت کے بجائے ایک تغیر پذیر بیانیاتی عمل کے طور پر سامنے آتی ہے اور کردار ہر بار اپنے تجربات کو نئے معنی دیتے ہیں۔^(۱۳) ناول کا مرکزی کردار 'زکریا' اپنے ماضی کو کسی ایک متعین صورت میں یاد نہیں کرتا بلکہ مختلف مواقع پر اسے نئے زاویوں سے دیکھتا اور بیان کرتا ہے۔ کبھی ماضی ایک پرسکون اور ہم آہنگ دنیا کے طور پر ظاہر ہوتا ہے تو کبھی وہی ماضی کھوئی ہوئی شناخت اور بکھری ہوئی حقیقتوں کی علامت بن جاتا ہے۔ مزید برآں اس ناول میں ذاتی یادداشت، تاریخی واقعات اور اساطیری بیانیے اس طرح باہم مدغم ہو جاتے ہیں کہ ماضی ایک مسلسل تشکیل پانے والی معنوی فضا بن جاتا ہے۔ اس طرح "بستی" یہ ظاہر کرتا ہے صدماتی یادداشت محض ماضی کی سادہ بازگشت نہیں بلکہ فعال عمل ہے جس کے ذریعے کردار اپنے تجربات کو ہر بار نئے معنی دیتے ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ صدماتی یادداشت کا یہ تغیر پذیر اور از سر نو تشکیل پانے والا عمل صرف بیانیاتی ناول کے کرداروں تک محدود نہیں رہتا بلکہ اجتماعی سطح پر بھی اسی نوعیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ تقسیم ہند جیسے تاریخی صدمے کے تناظر میں اردو ادب اس امر کی واضح مثال فراہم کرتا ہے جہاں مختلف ادیب ایک ہی واقعہ کو مختلف زاویوں سے یاد اور بیان کرتے ہیں۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" میں تقسیم کی عبثیت (Absurdity) اور انسانی لیے کو ایک خاص علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ "بستی" میں یہی تجربہ یادداشت، اساطیر اور ماضی کی بازیافت کے ذریعے ایک مختلف معنوی جہت اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح "اداس نسلیں" میں صدمہ ایک وسیع تاریخی شعور اور شناختی بحران کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ مختلف بیانیے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ صدمہ کسی ایک جامد حقیقت کے طور پر محفوظ نہیں رہتا بلکہ ہر تخلیق کار اپنے تجربے، سیاق اور فکری زاویے کے مطابق اسے از سر نو ترتیب دیتا ہے۔ اس طرح صدماتی یادداشت ایک فعال اور اجتماعی عمل بن جاتی ہے جو مختلف ادبی بیانیوں کے ذریعے مسلسل نئی تشکیل اختیار کرتی رہتی ہے۔

نو آبادیاتی سیاق و سباق میں، صدمہ اکثر نسل در نسل منتقل ہوتا ہے جس سے اجتماعی یادداشت، ثقافتی شناخت اور باہمی تعلقات متاثر ہوتے ہیں۔ اس طرح صدمہ صرف ایک نفسیاتی کیفیت نہیں بلکہ ایک سماجی اور سیاسی مظہر بھی ہے جو طاقت کے ڈھانچے، تاریخی نا انصافیوں اور جاری مظالم سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے برعکس مغربی صدمہ تھیوری کا "واقعہ پر مبنی" ماڈل جو صدمے کو ایک الگ تھلک واقعے کے طور پر پیش کرتا ہے، ایسے وسیع تر ساختی اور تاریخی عوامل کو شامل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ یہ نقطہ نظر بالخصوص ان

سماجی گروہوں کے لیے ناموزوں ہے جہاں صدمات صنفی بنیادوں پر، نوآبادیاتی جبر یا سرمایہ دارانہ نظام کے تحت مسلسل اور ساختی طور پر رونما ہوتے ہیں۔ اس تناظر میں، یہ ماڈل تشدد کے روزمرہ کے واقعات کو بھی کم اہمیت دیتا ہے جو مظلوم اقوام کے لیے مسلسل صدمے کا باعث بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر، پناہ گزین کیمپوں میں طویل عرصے تک رہنے والے افراد یا نوآبادیاتی حکمرانی کے تحت نسل در نسل مظالم کا شکار ہونے والے طبقے صدمے کے ایسے تجربات سے گزرتے ہیں جو کسی ایک واقعے تک محدود نہیں ہوتے بلکہ ان کی روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ فرائینڈین نفسیاتی تجزیہ اپنی انفرادی نوعیت کے باعث ان وسیع تر سماجی و سیاسی عوامل کو نظر انداز کر دیتا ہے جو صدمے کے گہرے تاریخی اور ادارہ جاتی ڈھانچوں کا تعین کرتے ہیں۔ اس نظریاتی تضاد کے تحت صدمہ تھیوری اخلاقی ہمدردی اور بین الثقافتی مکالمے کے بلند و بانگ دعوے تو کرتی ہے لیکن عملی طور پر ان نوآبادیاتی طاقتور ڈھانچوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتی ہے جو دراصل نفسیاتی مصائب کی بنیادی سماجی اور سیاسی وجوہات بنتے ہیں۔

صدمہ تھیوری کے روایتی ماڈل بنیادی طور پر "واقعہ پر مبنی" نقطہ نظر پر انحصار کرتے ہیں جس کے تحت صدمے کو کسی ایسے مخصوص ہولناک تجربے سے تعبیر کیا جاتا ہے جو زندگی کے لیے خطرہ بنے یا جس کا تعلق جسمانی نقصان سے ہو۔ اس محدود نقطہ نظر کے بعد برعکس ماریہ روٹ (Maria Root) کے مطابق "پوشیدہ صدمہ" کسی ایک نمایاں واقعے کے بجائے سماجی اور ثقافتی جبر کے مسلسل عمل کا نتیجہ ہے جو فرد کی نفسیاتی ساخت کو آہستہ آہستہ تحلیل کر دیتا ہے۔^(۱۵) یہ نظریہ اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ صدمہ محض ایک وقتی ہنگامی کیفیت نہیں بلکہ یہ سماجی و سیاسی ڈھانچوں کے زیر اثر ایک طویل مدتی استحصالی جبر پر مبنی نفسیاتی دباؤ ہے جو فرد کی شناخت کو مستقل متاثر کرتا ہے۔ اس کے متوازی سٹیف کرپس کا روزمرہ کا صدمہ کا تصور ان روزمرہ کے چھوٹے مگر مسلسل تکلیف دہ تجربات، بالخصوص روزمرہ کی چھپی ہوئی امتیازی زیادتیوں کو اجاگر کرتا ہے جو اپنی تکرار کے باعث وقت کے ساتھ گہرے صدماتی اثر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ روزمرہ کے صدمات دراصل ان وسیع تر سماجی اور ادارہ جاتی ناکامیوں کا مظہر ہیں جو پسماندہ طبقات کی نفسیاتی صحت پر مسلسل بوجھ ڈالتے ہیں۔

مزید برآں "ساختی صدمہ" کا نظریہ اس بات کو اجاگر کرتا ہے کہ یہ نفسیاتی شکست و ریخت تاریخی جبر، نسلی تعصب اور منظم عدم مساوات جیسے سماجی نظاموں کا براہ راست نتیجہ ہے جو پسماندہ برادریوں کو مسلسل از سر نو صدماتی تجربے کے خطرے سے دوچار رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر سیاسی تشدد یا پناہ گزینوں کو درپیش پالیسی ساز رکاوٹیں محض انفرادی نفسیاتی دباؤ نہیں بلکہ ایک ایسا اجتماعی صدمہ پیدا کرتی ہیں جو معاشرے کی سماجی سالمیت کو گہرائی سے متاثر کرتا ہے۔

یہ تمام تصورات اجتماعی طور پر صدمہ تھیوری کے روایتی ماڈل کو چیلنج کرتے ہوئے نفسیاتی شفا یابی کو محض انفرادی سطح سے ہٹا کر سماجی انصاف اور سیاسی بیداری کی تحریکوں سے منسلک کرنے کی ناگزیر ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ اس پیشرفت کا تقاضا ہے کہ "صدمے سے آگاہ" طریقوں کا دائرہ کار وسیع کیا جائے تاکہ پالیسی سازی میں ان ساختی اور ادارہ جاتی عوامل کو مرکزی حیثیت دی جاسکے جو پسماندہ طبقات کے لیے مسلسل صدمے کا باعث بنتے ہیں۔ اور صدمے کی تشریح کو محض طبی زمروں سے نکال کر ان سماجی تعمیرات کے سیاق و سباق میں لایا جائے جو کلینیکل اور سیاسی نظریات کے زیر اثر تقابذ پر رہتی ہیں۔

جہاں وسائل کی عدم فراہمی اور نظام کا دباؤ باہم مل کر ایک دائمی استحصال کی چکر بناتے ہیں وہاں فکری سانچے کی یہ بنیادی تبدیلی صدے کی تشفی کو پبلک ہیلتھ اور سماجی پالیسی کا ایک اہم ترین مسئلہ قرار دیتی ہے۔ اس ضمن میں معالجین کا بطور وکیل انصاف کردار ادا کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے تاکہ کلینکل مداخلتیں محض علامتی علاج تک محدود رہنے کی بجائے نظام کے جبر کے خاتمے کا ذریعہ بن سکیں۔ یہ علمی تبدیلی نفسیاتی نگہداشت کے روایتی سوال "آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟" کو "آپ کے ساتھ کیا ہوا" میں تبدیل کرنے کا مقناضی ہے تاکہ صدے کی بنیادوں میں بیوست ان ساختی اور سماجی عوامل کا درست ادراک ممکن ہو سکے۔

صدے کی تفہیم میں فکری سانچے کی یہ بنیادی تبدیلی نہ صرف طبی اور سماجی سطح پر اس کے اسباب کو ازسرنو متعین کرتی ہے بلکہ اس کے اظہار اور ادراک کے ذرائع کو بھی نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں صدہ تھیوری میں "بیانیے" کا کردار مرکزی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ اگر ایک طرف مابعد ساختیاتی نقطہ نظر صدے کو ایک ایسے تجربے کے طور پر دیکھتا ہے جو زبان اور نمائندگی کی حدود سے باہر ہے تو دوسری طرف متبادل نظریات بیانیے کو نہ صرف صدے کے اظہار بلکہ اس کی تفہیم اور بازیافت کا ایک موثر ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

جنوبی ایشیا بالخصوص برصغیر میں تقسیم ہند کا سانحہ محض وقتی واقعہ نہیں، ایک ایسا وجودی اور اجتماعی صدمہ ہے جس نے انسانی شناخت اور سماجی ساخت کو شدت سے متاثر کیا۔ بلکہ یہ ایک ایسی سماجی اور ثقافتی "بیانیہ سازی" کا عمل ہے جو اجتماعی شناخت کی تشکیل نو کرتا ہے۔ تاہم رائج مغربی صدمہ تھیوریز ان مقامی تاریخی تجربات کی ہمہ جہت پیچیدگیوں کا مکمل طور پر احاطہ کرنے سے قاصر رہی ہیں۔ تقسیم ہند کے تناظر میں یہ صدمہ صرف جانی و مالی نقصان تک محدود نہیں تھا بلکہ اس میں شناخت کا بحران، جغرافیائی بے دخلی، زبان اور ثقافت کا بکھراؤ اور رشتوں میں ٹوٹ پھوٹ بھی شامل تھی۔ مزید برآں یہ تجربہ ہر فرد کے لیے یکساں نہیں تھا۔ کسی کے لیے یہ ہجرت کا دکھ تھا، کسی کے لیے مچھرنے کا اور کسی کے لیے خاموشی میں دفن ہو جانے والا صدمہ۔ یہی وہ کثیر جہتی اور منتشر نوعیت ہے جسے ایک سادہ "واقعہ پر مبنی" مغربی ماڈل مکمل طور پر گرفت میں نہیں لاپاتا۔

اس عمل میں ادبی متون ان بکھرے ہوئے تجربات اور خاموش یادوں کو ایک ایسا بیانیہ عطا کرتے ہیں جس کے ذریعے ماضی کی ہولناکیاں محض تاریخی اعداد و شمار بننے کے بجائے انسانی وجود کی کثیر الجہت حقیقتوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ ان متون میں کار فرما جذباتی بیانیہ ایک متبادل تاریخ کی تشکیل کرتا ہے جہاں صدے کے شکار افراد محض مظلوم کرداروں کی بجائے اپنی تاریخ کے فعال محرک کے طور پر ابھرتے ہیں۔ ادبی متون اس تشدد کو قابل فہم بنانے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں جو محض تاریخی واقعات کی توثیق نہیں بلکہ اجتماعی بحران کے شکار گروہوں کے وجودی وقار کو بحال کرنے کی ایک شعوری کوشش ہے۔ اس تناظر میں ادب بالخصوص سرحد کے استعارے کو ایک فکری نمود دیتے ہوئے تقسیم کے صدے کو ایک ایسی وجودی جدوجہد کے طور پر پیش کرتا ہے جو فرد کی بکھری ہوئی شناخت کو نئے معنی فراہم کرتی ہے۔ "اداس نسلیں" (۱۶) میں مرکزی کردار نعیم کی زندگی برصغیر کی تقسیم سے پہلے اور بعد کے تاریخی و سماجی تغیرات کو سمیٹتی ہے۔ ناول میں دکھایا گیا ثقافتی و سماجی دھانچہ کسی ایک ملک (پاکستان یا بھارت) تک محدود نہیں رہتا بلکہ کرداروں کی

یادیں، تعلقات اور جذبات ایک ایسے "مشرکہ ماضی" سے جڑے ہیں جو تقسیم کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ یعنی سیاسی سرحدیں بن سکتی ہیں مگر تہذیبی اور تجرباتی تسلسل کو کاٹنا نہیں جاسکتا۔

مزید برآں اردو ادب کا تخلیقی عمل جغرافیائی لکیروں سے ماورا ہو کر اس مشرکہ تہذیبی وراثت کو مستحکم کرتا ہے جسے کسی بھی سیاسی تقسیم سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ اس عمل کے ذریعے اردو متون ان "deafening silences" کو توڑتے ہیں جو ساختی تشدد کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ادب کس طرح اجتماعی صدمے کو ایک متحرک معنیاتی نظام میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" (۱۷) کہانی میں پاگل خانے کے قیدیوں کی گفتگو بظاہر بے معنی ہے اور کبھی بہت معنی خیز خاموشی ہے خاص طور پر آخری منظر میں بشن سنگھ کا پاکستان اور بھارت کے بیچ کی زمین پر کھڑا رہنا اور کچھ واضح نہ کہنا۔ یہ ایک ایسی خاموشی ہے جو بہت کچھ کہہ رہی ہے۔

اردو ادب صدمے کی محض عکاسی کرنے کی بجائے اسے ایک ایسے بیانیاتی اور فکری عمل میں تبدیل کرتا ہے جہاں ٹوٹا ہوا زمانی تسلسل، ٹکرا اور یادداشت کے چکر، صدمے کی ساختی علامتوں کے طور پر معانی کی مسلسل تشکیل کرتے ہیں۔ اس تناظر میں اردو کے صدماتی بیانیے تاریخ کے معروضی ریکارڈ اور افسانوی تخلیق کی درمیانی فضا میں استوار ہوتے ہیں جہاں یادداشت کی آمیزش سے "تعبیراتی صدمہ" کا تصور جنم لیتا ہے اور صدمے کے معنی جامد رہنے کی بجائے وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا پذیر رہتے ہیں۔

"بستی" اور "راکھ" ایسے ناولوں کی مثالیں ہیں جہاں صدمہ کسی ایک متعین اور جامد معنی تک محدود نہیں رہتا بلکہ یادداشت اور بیانیے کے ذریعے مسلسل نئی تعبیرات اختیار کرتا ہے۔ "بستی" میں اساطیر، تاریخ اور ذاتی تجربات باہم مدغم ہو کر صدمے کو ایک تغیر پذیر معنوی عمل میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح "راکھ" میں سقوط ڈھاکہ کا تجربہ ایک مربوط تاریخی بیانیے کی بجائے بکھری ہوئی یادداشتوں اور خاموشیوں کے ذریعے سامنے آتا ہے جہاں خصوصاً نسوانی وجود کے ذریعے صدمے کی نئی جہات آشکار ہوتی ہیں۔ ان دونوں متون میں صدمہ نہ تو مکمل طور پر بیان ہو پاتا ہے اور نہ ہی ایک ہی معنی میں قید رہتا ہے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی تعبیر بدلتی رہتی ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ صدماتی تجربہ ایک مسلسل تشکیل پانے والا اور تعبیراتی (hermeneutic) عمل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو ادب میں صدمہ ایک ایسی متحرک اور تخلیقی قوت کے طور پر ابھرتا ہے جو مغربی صدمہ تھیوری کی حدود کو چیلنج کرتے ہوئے ایک ایسا متبادل فکری فریم ورک فراہم کرتا ہے جو ثقافتی طور پر حساس اور انسانی تجربات کی گہرائی سے ہم آہنگ ہے۔ یہ فکری تناظر دراصل والٹر لگنول (۱۸) کے "بارڈر تھکنگ" (border thinking) کے تصور سے ہم آہنگ ہے جس میں مقامی علمی نظام صدمے کے عالمی دعووں کو چیلنج کرتے ہوئے ایک منفرد اور ثقافتی طور پر مربوط تلافی کاراستہ تجویز کرتے ہیں۔

اردو ادب کا استعاراتی نظام سماجی سائنس کے ان روایتی تجزیوں کے برعکس گروہی تفریق سے بلند ہو کر ایک ایسا بیانیہ تخلیق کرتا ہے جو صدمے کے شکار افراد کے مابین باہمی رشتوں کی از سر نو بازیافت پر مرکوز ہے۔ "بستی" میں "بستی" بطور استعارہ صرف ایک جغرافیائی جگہ نہیں بلکہ ایک کھوئی ہوئی دنیا، یاد اور تعلق کا استعارہ ہے۔ جب بستی ٹوٹی ہے تو صرف مکان نہیں ٹوٹے بلکہ انسانی رشتے، یادیں اور شناخت بھی بکھر جاتی ہے۔ سعادت حسن منٹو کی کہانی "کھول دو" میں جسم بطور متن، خاموشی بطور جبر اور بیانیہ بطور گواہی پیش

کیا گیا ہے۔ "کھول دو" میں صدمہ بولنے سے پہلے جسم پر لکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کا ایک سادہ سا کلمہ "کھڑکی کھول دو" اور اس کے جواب میں سکینہ کے جسم کی خود کار حرکت صدمے کی سطح کو عیاں کرتی ہے، جہاں زبان ناکافی مگر بدن یادداشت کا حامل ہے۔ یہ پدر شاہی، فرقہ وارانہ تشدد اور مہاجر کیمپوں کی بے بسی کے اندر جبر کی علامت ہے۔ اس لیے یہ کہانی 'بیانیہ بطور سیاسی عمل' بھی ہے۔ منٹو بیانیہ رچاتے ہوئے ریاست، سماج کے اخلاقی انہدام پر گواہی دیتا ہے اور عورت کے خلاف تشدد کو نجی کی بجائے ساختی مسئلہ بنا دیتا ہے۔

فیض احمد فیض کی نظم "صبح آزادی" (۱۹) شاعری کی صنف میں بطور ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ جس میں آزادی ایک سیدھی نجات نہیں بلکہ ملی جلی خراش زدہ اور اخلاقی طور پر پیچیدہ 'صبح' ہے۔ صرف دو مصرعی ٹکڑے "یہ داغ داغ اجالا" اور "یہ وہ سحر تو نہیں" قومی بیانیہ کی تکمیل، فتح کے مقابل ایک صدماتی شعور پیش کرتے ہیں۔ آزادی ملی مگر اس کی قیمت میں بچھڑنا، قتل و غارت اور بے گھر ہونا شامل ہے۔ یعنی قومی امید اور اجتماعی شکست کے بیچ معنی کی نئی تشکیل ممکن ہوئی۔ یہی فلسفیانہ فضا ہے جس میں جنوبی ایشیا (خاص طور پر برصغیر پاک و ہند) کے صدمے کی نئی تھیوری ممکن ہو سکتی ہے۔

یورومرکزیت فریم ورک صدمے کو عموماً ایک حتمی انقطاع (rupture) شعور کے انتشار اور شناخت کے بکھراؤ کے طور پر پیش کرتی ہے۔ تاہم شمس الرحمن فاروقی کی تصنیف "گردش رنگ چمن" (۲۰) اس تصور کو ایک مختلف زاویے سے سامنے لاتی ہے۔ اس متن میں نوآبادیاتی زوال اور تہذیبی شکست کے باوجود صدمہ محض انہدام پر منتج نہیں ہوتا بلکہ روایت، یادداشت اور جمالیاتی شعور کے ساتھ ایک فعال مکالمے کے ذریعے از سر نو تشکیل (reconstruction) کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ اس طرح فاروقی کا بیانیہ ظاہر کرتا ہے کہ صدمہ نہ صرف معنی کو منتشر کرتا ہے بلکہ بعض صورتوں میں ایک تہذیبی و جمالیاتی تسلسل کو بھی برقرار رکھتا ہے جس کے ذریعے فرد اور معاشرہ اپنی شناخت کو نئے نئے سرے سے منظم کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یورومرکزیت پر مبنی صدمہ تھیوری صدمے کی شدت اور انقطاع کو سمجھنے میں تو معاون ہے مگر اردو ادب جیسے غیر مغربی متون میں موجود تخلیقی، تعمیری اور تسلسل کے پہلوؤں کو مکمل طور پر گرفت میں لینے سے قاصر رہتی ہے۔

خشونت سنگھ کا تعلق برصغیر کی تقسیم کے تجربے سے اچھی طرح جڑا ہوا ہے۔ ان کے موضوعات، کردار اور فکری تناظر براہ راست برصغیر خصوصاً پنجاب کی تہذیب، تاریخ اور تقسیم کے صدمے سے وابستہ ہیں۔ ان کے ناول "Train to Pakistan" میں صدمے کی نمائندگی محض تشدد اور انہدام تک محدود نہیں رہتی بلکہ انسانی رشتوں اور اخلاقی انتخاب کی نئی جہات کو بھی آشکار کرتی ہے۔ (۲۱) بالخصوص 'جگت سنگھ' کا کردار اس امر کی مثال ہے کہ صدماتی حالات کے باوجود فرد کے اندر ایک ایسی اخلاقی بیداری جنم لے سکتی ہے جو اجتماعی انسانیت کو بچانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس طرح ناول یہ ظاہر کرتا ہے کہ صدمہ نہ صرف شعور اور سماجی ڈھانچوں کو متاثر کرتا ہے بلکہ بعض مواقع پر ایک نئی اخلاقی معنویت اور انسانی یکجہتی کو بھی جنم دیتا ہے جو اسے صرف 'انقطاع' (rupture) کی بجائے ایک تعمیری اور تہذیبی کے عمل کے طور پر سمجھنے کی دعوت دیتی ہے۔

یورومرکزیت فریم ورک کا مسئلہ صرف 'موضوعات' کا نہیں بلکہ معیار کا ہے جب یورپ اپنے تاریخی تجربے کو آفاقی بیانیہ بناتا ہے تو نوآبادیاتی، بعد نوآبادیاتی صدمات ثانوی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایڈورڈ سعید کی "شرق شناسی" (۲۲) ہمیں دکھاتی ہے کہ علم یا بیانیہ

طاقت کے رشتوں سے الگ نہیں لہذا صدمے کی تعریف بھی اگر صرف ایک تہذیبی مرکز سے بنے تو لازماً دوسرے تجربات پر حاکم ہو جائے گی۔

اس کے برعکس اردو ادب خصوصاً تقسیم کے بعد کا بیانیہ صدمے کو محض فرد کی نفسیاتی خرابی تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے تاریخ، شناخت، جنس، ریاست اور روزمرہ زندگی کے پیچیدہ تناظر میں ایک تعبیراتی و فلسفیانہ مسئلہ بنا دیتا ہے۔ یوں اردو بیانیہ صرف 'ڈیٹا' فراہم نہیں کرتا بلکہ خود تھیوری کے لیے خام مواد مہیا کرتا ہے جو ایک ایسے جنوبی ایشیائی تصور صدمہ کی تشکیل کی طرف اشارہ کرتا ہے جو یورپ و مرکز، واقعہ مرکز اور محض کلینیکل تعریفوں سے آگے بڑھ کر ساختی انصاف اور معنی کی تشکیل کو اپنی فکر کا محور بنا دیتا ہے۔ اسی لیے ایک زیادہ منصفانہ اور جامع صدمہ تھیوری کی تشکیل تبھی ممکن ہے جب ان متبادل بیانیوں کو نہ صرف شامل کیا جائے بلکہ انہیں علم کی تشکیل میں مرکزی حیثیت دی جائے تاکہ صدمے کو اس کی کثیر جہتی، تاریخی اور تہذیبی پیچیدگیوں کے ساتھ سمجھا جاسکے۔

حواشی و حوالہ جات

- ۱۔ گور بیٹے ایک کینیڈین معالج اور مصنف ہیں جو صدمے کو ایک داخلی نفسیاتی رد عمل کے طور پر سمجھتے ہیں؛ ملاحظہ ہو 'دی مٹھ آف نارل: ٹروما، ال اینس اینڈ ہیلمنگ ان اے ٹوکسیک کلچر'، کینیڈا، ۲۰۲۲ء
- ۲۔ فرائیڈ، سگمنڈ، ہیونڈی پلیئر ٹرپرنسپل، ۱۹۲۰ء
- ۳۔ کیروتھ، کیتھی، ان کلیمڈ ایکسپیرینس: ٹراما، نیو یو اینڈ ہسٹری۔ جانز ہاپکینز یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۶ء
- ۴۔ ٹینٹن، والٹر، تھیسز آن دی فلاسفی آف ہسٹری، الومی نیشنز، مرتبہ ہٹا آرٹ، شوکن بکس، ۱۹۶۸ء
- ۵۔ فیلسن، شوٹانا، اور جیفری ہارٹ مین۔ ٹیسٹمنی: کراسز آف وٹنسنگ ان لٹریچر، سائیکو اینالیسیس اینڈ ہسٹری، رولٹیج، ۱۹۹۲ء
- ۶۔ شوآہ 'Shoah' ایک عبرانی اصطلاح ہے جو خاص طور پر یورپ میں ہولوکاسٹ 'Holocaust' کے دوران نازی جرمنی کے ہاتھوں یہودیوں کی منظم نسل کشی (1941-1945) کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اس لفظ کا مطلب 'تباہی' یا 'مکمل بربادی' ہے۔ جبکہ Holocaust کی اصطلاح یونانی لفظ holokaustos سے آئی ہے، جس کا مطلب ہے 'مکمل طور پر جلائی گئی قربانی' (burnt sacrifice)۔ اس میں ایک مذہبی مفہوم شامل ہے۔ گویا اس سانحے کو کسی طرح 'قربانی' یا 'مقصد' کے ساتھ جوڑا جاسکتا ہے۔ شوآہ کو لفظ 'ہولوکاسٹ' کے مقابلے میں اس لیے ترجیح دی جاتی ہے کہ یہ اس واقعے کو ایک مخصوص تاریخی و انسانی سانحے کے طور پر نمایاں کرتا ہے، بغیر کسی مذہبی 'قربانی' کے مفہوم کے۔ معاصر علمی مباحث میں شوآہ کو صدمے، یادداشت، اور نمائندگی کے مسائل کو سمجھنے کے لیے ایک مرکزی حوالہ کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو: 'شوآہ، کلاؤڈ لینزمان، پیرس، گیل مارڈ، ۱۹۸۵ء
- ۷۔ لوب، ڈوری، بیرنگ وٹنس اور دی سیمیٹیوڈز آف لسٹنگ، ٹیسٹمنی، مرتبہ شوٹانا فیلسن و جیفری ہارٹ مین، رولٹیج، ۱۹۹۲ء
- ۸۔ لاکاپرا، ڈومینک، رائٹنگ ہسٹری، رائٹنگ ٹراما۔ جانز ہاپکینز یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۱ء

۹۔ یورومرکزیت (Eurocentrism) سے مراد وہ فکری رجحان ہے جس میں یورپی تاریخ، ثقافت اور تجربات کو عالمی معیار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جبکہ دیگر تہذیبوں اور معاشروں کے تجربات کو نظر انداز یا کم تر سمجھا جاتا ہے۔ یورومرکزیت (Eurocentrism) کی اصطلاح کو ایک واضح نظریاتی شکل سمیر امین (Samir Amin) نے اپنی کتاب "Eurocentrism" (۱۹۸۸ء) میں دی جہاں وہ اس فکری رجحان پر تنقید کرتے ہیں جس کے تحت یورپی تاریخ اور تجربات کو عالمی معیار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس تصور کی ابتدائی فکری بنیادیں ایڈورڈ سعید کی کتاب (شرق شناسی، ۱۹۷۸ء) میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں جہاں مغرب کی جانب سے مشرق کی نمائندگی کو طاقت اور علم کے تناظر میں تحلیل کیا گیا ہے۔

۱۰۔ مائیکل روٹھبرگ ایک معاصر ادبی نقاد اور نظریہ ساز ہیں جنہوں نے صدمہ، یادداشت اور تاریخ کے باہمی تعلق پر اہم کام کیا ہے۔ وہ بالخصوص اپنے تصور 'multidirectional memory' کے لیے معروف ہیں جس کے مطابق مختلف تاریخی صدمات ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہیں ہوتے بلکہ باہم مربوط اور متعال ہوتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ صدمہ تھیوری کو یورو مرکز فریم ورک سے نکال کر ایک زیادہ شمولیتی اور مابعد نوآبادیاتی تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ملاحظہ ہو:

مائیکل روٹھبرگ، ملٹی ڈائریکشنل میموری: ریٹیمبرنگ دی ہولوکاسٹ ان دی ایچ آف ڈی کلونائزیشن، ۲۰۰۹ء

۱۱۔ کریٹس، اسٹیف۔ پوسٹ کالونیل وٹنسنگ: ٹراما آؤٹ آف ہاؤنڈز۔ پالگریو میکملن، ۲۰۱۳ء

۱۲۔ بالائیف، مشیل، ٹریڈز ان لٹریچر ٹراما تھیوری، موزائیک، جلد ۴۱، شمارہ ۲، ۲۰۰۸ء، ص ۱۳۹-۱۶۶

۱۳۔ لاگونابو بلو (Laguna Pueblo) شمالی امریکہ کے مقامی (Native American) قبائل میں سے ایک ہے، جس کی اپنی ایک ثقافت، روحانی و مذہبی عقائد اور روایات ہیں جہاں فرد کو ایک الگ اور خود مختار اکائی کے طور پر نہیں بلکہ ایک وسیع اجتماعی اور روحانی نظام کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق فرد اپنی ذات میں مکمل نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی برادری، زمین اور ایک بڑے روحانی کائناتی نظام سے گہرے طور پر جڑا ہوتا ہے۔ اس تناظر میں صدمہ محض ایک نفسیاتی یا شخصی عارضہ نہیں بلکہ ایک وسیع روحانی اور اجتماعی عدم توازن (imbalance) کے طور پر سمجھا جاتا ہے جس کا علاج روایتی رسومات (ceremonies)، کہانی سنانے (storytelling) اور قبائلی علم کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔ لیزلی مارمن سلکو کے ناول "Ceremony" (۱۹۷۷ء) میں یہ تصور واضح طور پر سامنے آتا ہے، جہاں مرکزی کردار (Toyo) کی بازیابی مغربی نفسیاتی تشخیص (جیسے PTSD) کے بجائے لاگونابو بلو کے ثقافتی و روحانی نظام کے ذریعے ممکن ہوتی ہے۔ اس طرح یہ ناول صدمے کی ایک بین الثقافتی تعبیر پیش کرتا ہے، جو مغربی صدمہ تھیوری کی محدودیت کو چیلنج کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو: مشیل بالائیف، ٹریڈز ان لٹریچر ٹراما تھیوری، موزیک: این انٹرسپلنری کریٹیکل جرنل، جلد ۴۱، شمارہ ۲، ۲۰۰۸ء ص

۱۳۹-۱۶۶

۱۴۔ انتظار حسین، بستی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۰ء

۱۵۔ روٹ، ماریا پی۔ پی۔ "ریکنسٹر کٹنگ دی اسپیکٹ آف ٹراوما آن پرسنالٹی"۔ پرسنالٹی اینڈ سائیکو پیٹھالوجی: فیمنسٹ ری اپریزڈ، مرتبہ

لورا ایلس براؤن و میری بالو، گلغور ڈپریس، ۱۹۹۲ء، ص ۲۲۹-۲۶۵

۱۶۔ عبداللہ حسین۔ اداس نسلیں۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۶۳ء

۱۷۔ منٹو، سعادت حسن۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ"۔ منٹو کے افسانے۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء

۱۸۔ واٹرگنولو (Walter Mignolo) کے مطابق بارڈر تھنکنگ (border thinking) سے مراد وہ فکری زاویہ ہے جو نوآبادیاتی

تاریخ کے نتیجے میں وجود میں آنے والی سرحدی حیثیت سے جنم لیتا ہے۔ یہ وہ سوچ ہے جو غالب مغربی علمیات (western

epistemology) کے مرکز سے نہیں بلکہ حاشیے (margins) اور مختلف تہذیبوں کے درمیان واقع 'سرحدی مقام' سے ابھرتی

ہے۔ گنولو کے نزدیک بارڈر تھنکنگ ایک تنقیدی عمل ہے جو طاقت، علم و شناخت کے غالب ڈھانچوں کو چیلنج کرتے ہوئے مقامی، متبادل

اور غیر مغربی علمی روایتوں کو سامنے لاتا ہے۔ اس طرح یہ تصور ایک نوآبادیاتی اثرات سے پاک علمیات (decolonial

epistemology) کی تشکیل میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے جہاں علم کو ایک کثیر جہتی اور متنوع شعبے کے طور پر سمجھا جاتا ہے نہ کہ

صرف مغربی تناظر تک محدود۔ ملاحظہ ہو: گنولو، ڈبلیو، ڈی، لوکل ہسٹریز، گلوبل ڈیزائن: کلونیو لیٹی، سب الٹرن انڈیا بارڈر تھنکنگ،

پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۲ء

۱۹۔ فیض، فیض احمد، صبح آزادی، نسخہ ہائے وفا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۶

۲۰۔ فاروقی، شمس الرحمن، گردش رنگ چمن، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء

۲۱۔ خوشنونت سنگھ، ٹرین ٹو پاکستان، گروپ پریس، ۱۹۵۶ء

۲۲۔ سعید، ایڈورڈ ڈبلیو اور اینگلز مہینتھیون بکس، ۱۹۷۸ء

References in Roman Script:

1. Gabor Maté is a Canadian doctor and author who views trauma as an internal psychological response; see 'The Myth of Normal: Trauma, Illness and Healing in a Toxic Culture' Knopf Canada, 2022
2. Freud, Sigmund. Beyond the Pleasure Principle. 1920
3. Caruth, Cathy. Unclaimed Experience: Trauma, Narrative, and History. Johns Hopkins UP, 1996
4. Benjamin, Walter, Theses on the Philosophy of History, Illuminations, edited by Hannah Arendt, Schocken Books, 1968
5. Felman, Shoshana, and Geoffrey Hartman. Testimony: Crises of Witnessing in Literature, Psychoanalysis, and History. Routledge, 1992
6. 'Shoah' is a Hebrew term specifically used for the organized genocide of Jews by Nazi Germany in Europe during the Holocaust (1941-1945). The word means 'catastrophe' or 'complete destruction'. On the other hand, the term Holocaust

- comes from the Greek word holocausts, meaning 'completely burnt sacrifice', carrying a religious connotation, as if this tragedy could somehow be linked with a 'sacrifice' or 'purpose'. Shoah is preferred over the word 'Holocaust' because it highlights the event as a distinct historical and human catastrophe, without any religious notion of 'sacrifice'. In contemporary academic debates, Shoah is also seen as a central reference for understanding trauma, memory, and representation issues. See: Claude Lanzmann 'Shoah', Paris: Gallimard, 1985
7. Laub, Dori, Bearing Witness or the Vicissitudes of Listening, Testimony, edited by Shoshana Felman and Geoffrey Hartman, Routledge, 1992
 8. LaCapra, Dominick. Writing History, Writing Trauma. Johns Hopkins UP, 2001
 9. Eurocentrism refers to the intellectual trend in which European history, culture and experiences are presented as the global standard, while the experiences of other civilizations and societies are overlooked or considered inferior. The term Eurocentrism was clearly shaped by Samir Amin in his book 'Eurocentrism' (1988), where he critiques this trend of presenting European history and experiences as the global norm. The early intellectual foundations of this idea can also be seen in Edward Said's book 'Orientalism' (1978), which analyses the representation of the East by the West in the context of power and knowledge.
 10. Michael Rothberg is a contemporary literary critic and theorist who has done important work on the interrelation of trauma, memory and history. He is especially known for his concept of 'multidirectional memory', which suggests that different historical traumas are not isolated but interconnected and interactive. In his writings, he emphasizes the need to move trauma theory out of a Eurocentric framework and understand it in a more inclusive and postcolonial context. See: Michael Rothberg, Multidirectional Memory: Remembering the Holocaust in the Age of Decolonization (2009)
 11. Craps, Stef. Postcolonial Witnessing: Trauma Out of Bounds. Palgrave Macmillan, 2013
 12. Balaev, Michelle. "Trends in Literary Trauma Theory." Mosaic, vol. 41, no. 2, 2008, p. 149–166. University of Manitoba.
 13. Laguna Pueblo is one of the Native American tribes in North America, with its own culture, spiritual and religious beliefs, and traditions, where an individual is not seen as a separate and autonomous entity but as part of a larger communal and spiritual system. According to this perspective, an individual is not complete on their own but is deeply connected to their community, land, and a greater spiritual cosmic system. In this context, trauma is understood not merely as a psychological or personal disorder but as a broader spiritual and communal imbalance, which can be addressed through traditional ceremonies, storytelling, and tribal knowledge. This idea is clearly illustrated in Leslie Marmon Silko's novel "Ceremony" (1977), where the main character, Toyo, recovers not through Western psychological diagnosis (such as PTSD) but through the cultural and spiritual system of the Laguna Pueblo. In this way, the novel offers a cross-cultural interpretation of trauma, challenging the limitations of Western trauma theory.

- See: Michelle Balaif, Trends in Literary Trauma Theory, Mosaic: An Interdisciplinary Critical Journal, vol. 41, no. 2 (2008), p. 149–166
14. Husain, Intizar. Basti. Lahore, Sang-e-Meel Publications, 1980
 15. Root, Maria P. P, Reconstructing the Impact of Trauma on Personality, Personality and Psychopathology: Feminist Reappraisals, edited by Laura S. Brown and Mary Ballou, Guilford Press, 1992, p. 229–265
 16. Hussain, Abdullah. Udaas Naslain. Lahore, Sang-e-Meel Publications, 1963
 17. Manto, Saadat Hasan. "Toba Tek Singh." Manto ke Afsanay. Lahore, Sang-e-Meel Publications, 2009
 18. According to Walter Mignolo, border thinking refers to the perspective that emerges from the border conditions created by colonial history. It's a way of thinking that doesn't come from the centre of dominant Western epistemology but arises from the margins and the 'border loci' between different civilizations. For Mignolo, border thinking is a critical practice that challenges structures of power, knowledge, and identity while bringing forward local, alternative, and non-Western epistemic traditions. In this way, the concept plays a central role in shaping decolonial epistemology, where knowledge is seen as a multidimensional and diverse field rather than being limited to a Western perspective. See: Mignolo, W. D. (2012). Local Histories/Global Designs: Coloniality, Subaltern Knowledges, and Border Thinking. Princeton University Press
 19. Faiz, Faiz Ahmed, Subh-e-Azadi, Nuskha-haye-Wafa, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 1984, p. 116
 20. Faruqi, Shamsur Rahman, Gardish-e Rang-e Chaman, Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), New Delhi, 2016.
 21. Singh, Khushwant. Train to Pakistan. Grove Press, 1956
 22. Said, Edward W. Orientalism. Pantheon Books, 1978



Mrs. Humaira Sadaf is a PhD Scholar at the Centre for the Study and Research on the Literatures and Oralities of the World (CERLOM), INALCO, Paris, France. She completed her MPhil from the National University of Modern Languages (NUML), Islamabad, Pakistan. Her academic interests include Urdu fiction, comparative literature, translation studies, and cross-cultural literary research.